© rasailojaraid.com

پاکستان کا مطلوب شہری اور نظامِ تعلیم

عبدالحمید صدیقی

[ایک مقالہ جو اشاعتِ تعلیم کالج لاہور کے یومِ والدین میں ۵ رجون کو پڑھا گیا۔]

صاحبِ صدر اور معزز حضرات!

عام طور پر کوئی ایسا ملک جو نیا نیا دنیا کے سینے پر ابھرا ہو اپنے سامنے بلاشبہ یہ پیچیدہ مسئلہ رکھتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے فکر و نگاہ کے کونسے زاویے اور عمل کے کونسے میدان متعین کرے۔ اور اسی طرح ایک نئی قوم کے لیے بھی یہ سوال کافی پریشان کُن ہوتا ہے کہ وہ اپنے افراد کو کس مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل کرے۔ کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم کے لیے یہ دونوں سوالات شدید اضطراب کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے یہ دونوں سوالات سرے سے کسی پیچیدگی کے حامل نہیں۔ ہم انہیں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے بہت پہلے طے کر چکے ہیں بلکہ پاکستان اِنہی پریشانیوں اور اضطرابات کو دُور کرنے کے لیے ہی تو معرضِ وجود میں آیا تھا۔

مسلمانوں کے اندر صدیوں سے یہ چھپتا ہُوا احساس موجود چلا آرہا ہے کہ اُن کی حیاتِ اجتماعی اُس خاکے اور نقشے کے مطابق نہیں ہے جو ہمیں اسلام نے دیا ہے اور جس کے عملی مضمرات ہمیں سنتِ رسول اور آثارِ صحابہ میں ملتے ہیں۔ آپ مسلمانوں کی کسی انقلاب انگیز تحریک کا جائزہ لیں، آپ کو اس کے پیچھے یہی احساس کارفرما نظر آئے گا۔ مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ اور اُن کے فرزندانِ ارجمند کے افکار و نظریات، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد، دیوبند اور ندوہ کی تعلیمی سرگرمیاں، تحریکِ خلافت، مولانا شبلیؒ، حالیؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار و تصورات، غرض ان سب فکری اور عملی کوششوں میں یہی احساس جاری و ساری نظر آتا ہے۔ بلکہ خود تحریکِ پاکستان بھی اسی احساس کی مظہر ہے۔ برِعظیم ہند ہی کے نہیں، پوری دنیا کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ خطّۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ اپنی الگ اور مستقل تہذیب کا شعور رکھتے تھے اور ان اجتماعی تخیّلات اور معاشرتی افکار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جن سے ہندوستانی وطنی تحریک کا مزاج تیار ہوا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مسلمانوں کے لیے اس میں کیا قباحت تھی کہ وہ بھی عیسائیوں، پارسیوں اور سکھّوں کی طرح ایک محدود معنی میں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قومیت کا جزو بننے پر راضی ہو جاتے۔ آخر اس میں کیا چیز مانع تھی کہ مسلمان اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی رسوم و عبادات اور بعض معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے امورِ مملکت کے انصرام اور نظمِ اجتماعی کی تشکیل میں ہندوؤں سے پورا پورا اشتراکِ عمل کر لیتے اور اس ملک کا بٹوارا نہ ہوتا۔ کانگرس کا استدلال یہی تو تھا کہ جب تم اپنی مذہبی آزادی برقرار رکھ کر بھی ہندوستانی قومیت میں شامل ہو سکتے ہو تو پھر مذہبی اساس پر ایک علیحدہ قومیت کا ادعا کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کر سکتے، کیونکہ مذہب ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبداء اور اس کی اساس ہے۔ ہماری تہذیب میں مذہب صرف ایک عنصر کی حیثیت سے داخل نہیں بلکہ وہی اس تہذیب کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اس لیے ہم مذہب کو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی، ملکی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کریں، یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو ہمارے مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احساسات و تخیلات سے متاثر ہو۔ یہ جواب بالکل معقولیت پر مبنی اور اسلام کے مزاج اور تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

حضرات! آپ خود ہی غور فرمائیں کہ جو ملک اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا ہو اور جس کے قیام کا منتہائے مقصود ہی اسلامی تعلیمات کی عملی تعبیر ہو، اس ملک کے باشندوں کے بارے میں اب یہ سوچنا کہ انہیں کس تہذیب و تمدن کا خادم بنایا جائے، کس نوعیت کی امتیازی صفات سے انہیں متصف کیا جائے، کس نصب العین کو اُن کی سرگرمیوں کا ہدف ٹھہرایا جائے اور کس مقصد کے لیے انہیں سرگرمِ عمل اور متحرک کیا جائے، محض ایک بوالفضولی ہے۔ ان سارے امور کا فیصلہ تو ہم پہلے ہی کر چکے تھے اور اُسی فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ہم نے جان و مال اور عزت و آبرو کے ناقابلِ بیان نقصانات برداشت کر کے ایک الگ خطّہٗ ارضی حاصل کیا تھا۔

حضرات! پاکستان مسلمانوں کے دینی احساسات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ اُن کی آرزوؤں کا مرکز، اُن کے عزائم اور ارادوں کا محور اور اُن کی امنگوں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔ اسے صرف احیائے اسلام کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اسی غرض کے لیے یہاں کے باشندے اس کے حفظ و بقا کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہے ہیں۔ پاکستان ایک خطّہٗ ارضی ہی نہیں بلکہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی ایک انقلاب انگیز تحریکِ فکر و عمل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں دین صرف ایک محکمۂ اوقاف یا ایک شیخ الاسلامی یا ایک وزارتِ امورِ دینیہ کے قیام تک محدود نہ ہو بلکہ پوری اجتماعی زندگی، سیاست، معیشت، معاشرت، عدالت، قانون، تعلیم، غرض حیاتِ اجتماعی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہو۔

پاکستان کے اس پس منظر اور اس کے ساتھ وابستہ ان جذبات و احساسات کو اگر سامنے رکھا جائے تو پاکستان کے مطلوب شہری کے اوصاف کا تعین کچھ مشکل نہیں رہتا۔ پاکستان کا مطلوب شہری وہی ہو سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا امین اور علمبردار ہو۔ اس ملک کو جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا اِس کے شہریوں کی توجہ لازماً اسی مقصد کے حصول پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اسلام کے ساتھ سچی محبت و وابستگی، اس کی سربلندی کا مخلصانہ جذبہ اور اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کی گہری لگن ایک پاکستانی کے امتیازی اوصاف ہونے چاہییں۔ اگر وہ اِن مقاصد کو نظر انداز کر کے اور بعض دوسرے مقاصد کے حصول اور بعض دوسرے اوصاف کو اپنانے کے لیے تگ و دو کرتا ہے تو یہ پاکستان کے اساسی تصور کے خلاف صریح بغاوت ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم پاکستان کے یہ مطلوب شہری پیدا کر سکتا ہے؟

ظاہر بات ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم، جو دراصل انگریز کے لیے چند مفید مطلب کارکن پیدا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا تھا، اور جس کے پیشِ نظر ہندوستانیوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کرنا تھا جو خون کے اعتبار سے تو بلاشبہ ہندوستانی ہو مگر فکر و نظر اور جذبات و احساسات کے لحاظ سے خالص فرنگی ہو۔ پاکستان کے اِن تقاضوں کو کسی اعتبار سے بھی پورا نہیں کر سکتا۔
مروجہ نظامِ تعلیم میں تعلیم کا مقصد اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ؎

بی، اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

موجودہ نظامِ تعلیم نے ہماری نوخیز نسلوں کو اسی لیے کسی بلند تر مقصد سے آشنا نہیں کیا۔
اس مجلس میں کئی نامور اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم موجود ہیں۔ اِن سے دریافت کیجیے تو وہ آپ کو خود بتا دیں گے کہ آج کل کا طالب علم اپنے سامنے کوئی اونچا اور بلند مقصد نہیں رکھتا۔ اس کی تگ و دو کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ کسی طرح امتحانات پاس کر لیے جائیں اور پھر ان ڈگریوں کی مدد سے کوئی ایسی ملازمت تلاش کر لی جائے جو اُسے اقتدار اور خوشحالی سے بہرہ مند کر دے۔

اب اگر ہم واقعی اس ملک کی نوخیز نسلوں کو اسلام کا شیدائی بنانے کا عزم رکھتے ہیں تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ کام محض نصاب کی ترتیب میں چند مضامین کے تغیر و تبدل سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس ملک کے حاکم و محکوم اسلام کے معاملے میں یکسُو ہوں اور وہ اس منافقانہ طرزِ عمل کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو جائیں جو انہوں نے دین کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ اُس نے اپنے دین کی خدمت کے لیے معاشرے کے کمزور طبقوں، چرواہوں، مچھیروں اور غلاموں تک سے کام لیا ہے لیکن منافقوں اور آبرو باختہ لوگوں سے اس کو ہمیشہ بچایا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آج نہ صرف اس ملک میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینِ حق کے ساتھ جو شرمناک مذاق کیا جا رہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے نوخیز نسلیں اسلام سے کس طرح متاثر ہو سکتی ہیں۔ الناس علیٰ دین ملوکہم ایک ایسی ہمہ گیر سچائی ہے جس کی صحت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ جن لوگوں پر اسلامی نظام کے قیام کی براہِ راست ذمّہ داری عائد ہوتی ہے، جب وہ خود ہی دین کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں تو نوجوان اُسے آخر کس طرح سنجیدگی سے اپنا سکتے ہیں۔ وہ بیچارے ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے دین کو بازیچۂ اطفال بنتے دیکھتے ہیں۔ اُن کے کانوں میں برسرِ اقتدار طبقوں کی اسلام سے گہری وابستگی اس کے ساتھ گہری عقیدت کی داستانیں پڑتی ہیں۔ وہ ان حضرات کی زبان فیض ترجمان سے آئے دن یہ سنتے رہتے ہیں کہ اسلام ہی ہماری اور پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا واحد حل ہے اور اسی میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز مضمر ہے۔ یہ باتیں سن سُن کر نوجوان نسلوں کے اندر اسلام کے متعلق کچھ اچھے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ اسلام کی محبت کا دم بھرنے والے انہی لوگوں کا رویّہ دنیائے عمل میں دیکھتے ہیں، تو انہیں یہ سبق ملتا ہے کہ اسلام صرف باتیں بنانے کے لیے ہے، عمل کے لیے نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کوئی رنگین غبارہ ہے جسے ہماری قوم کے بڑے لوگ اپنے عوام کا دل بہلانے کے لیے اڑایا کرتے ہیں۔ اُن کے دل و دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ یہ دین اس قوم کی قوت و طاقت کا سرچشمہ نہیں بلکہ اُس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کمزوری ہے جس سے بوقتِ ضرورت فائدہ اٹھانے کے کسی موقع کو تو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے مگر عمل کی دنیا میں اس کی ہدایات اور پابندیوں سے ہر طرح گریز کرنا چاہیے۔ دو رنگی اور تضاد کی اس فضا میں آخر کس طرح نوخیز نسلوں کو اسلام کا علمبردار بنایا جا سکتا ہے چنانچہ اس ماحول میں ہماری جو نوجوان نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں وہ بھی دین کو بس ایک کھلونے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ جب کسی مجلس کو گرمانے یا کوئی مؤثر بیان دے کر عوام کے جذبات سے کھیلنے کی ضرورت پیش آئی تو فوراً اس کو استعمال کر لیا لیکن جہاں اس دینِ حق نے کسی معمولی سے معمولی ایثار کا مطالبہ کیا وہاں اس سے اس طرح آنکھیں چرا کر نکل گئے جیسے کہ اُن کا اللہ کے اِس دین سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

اس ماحول میں جو سوسائٹی تشکیل پا رہی ہے وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے بڑی کمزور اور بودی ہے۔ آپ خود حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ موجودہ معاشرے میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنا کوئی ضمیر رکھتے ہیں اور پھر اس ضمیر کے مطابق عمل کرنے کا عزم اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ مکر، فریب، ریاء، بے اصولی، خوشامد ہماری قومی زندگی کی خصوصیات بن چکی ہیں۔ چند مقدس مستثنیات کو چھوڑ کر ہر فرد جائز و ناجائز طریق سے دولت اور اقتدار حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جب انسان چشم تصور میں حالات پر نگاہ ڈالتا ہے تو یوں نظر آتا ہے کہ ضمیر فروشوں کے ٹولے اپنی متاعِ ایمان کا سودا کرنے کے لیے گاہکوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کوئی بے جان سکّوں کے عوض اسے بیچنے کے لیے تیار ہے، کوئی کسی اونچے عہدے کے لالچ میں اسے فروخت کرنے پر تلا ہوا ہے، اور کوئی حکمرانوں کی چشم التفات پر اسے بطور نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ہر شخص نے اپنی جگہ اس مال کی ایک قیمت تجویز کر رکھی ہے اور جب وہ قیمت مل جاتی ہے تو بلا تامل وہ اسے بیچ ڈالتا ہے۔ ایسا معاشرہ نوجوان کو کسی نصب العین کا علمبردار کس طرح بنا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرات! کسی نصب العین سے ایک انسان کو کس قدر وابستگی اور محبت ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس کا ایک ہی معیار ہے کہ انسان جس مقصد کو اپنانے کا دعویدار ہے اس کے لیے وہ کتنا ایثار کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی بنیادی عبادات کو ہی لیجیے۔ جنہیں اسلام اولین اہمیت دیتا ہے۔ آپ کو ایک نہایت قلیل تعداد صحیح معنوں میں ان کی پابند نظر آئے گی۔ اسلام کی اخلاقی اقدار کے متعلق بھی ہمارے ہاں ایک عام لاپروائی بلکہ بغاوت کا رجحان نظر آتا ہے، خصوصاً صنعت و تجارت میں معمولی معمولی فوائد کی خاطر بڑی بے تکلفی کے ساتھ جھوٹ اور فریب سے کام نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر میں شاید ہی چند خوش نصیب افراد ایسے ہوں جو رشوت ملنے کے باوجود محض اللہ کے خوف سے اس حرام خوری سے بچنے کی کوشش کرتے ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے اندر جو عام اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہے وہ تو خیر اپنی جگہ بڑا تشویشناک ہے ہی، لیکن اس کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ خود دیندار طبقوں کے اندر بھی "امورِ دنیا" کے معاملے میں وہ اخلاقی احساس باقی نہیں رہا جو ان کی اسلام سے سچی وابستگی ظاہر کر سکے۔ یہ حضرات خواہ زبان سے یہ کہتے رہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے لیکن عملی میدان میں، اسلام ان کے نزدیک ایک خالص روحانی وظیفہ ہے جس کا انسان کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے دیندار طبقوں کا یہ رویہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اسلام زندگی کی غایتِ اولیٰ نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے متعدد شعبوں میں صرف ایک شعبہ ہے جس کا زندگی کے دوسرے گوشوں سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔

جس معاشرے میں بنیادی مقصدِ حیات کے ساتھ عوام کی وابستگی کے یہ انداز ہوں اس معاشرے کی نوخیز نسلوں کو اسلام کا علمبردار بنانا حکایتِ تشنہ و سراب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک بچے کو ماحول سے یکسر الگ کر کے کس طرح تربیت دی جا سکتی ہے وہ قدم قدم پر اسلام کے بارے میں دورنگی اور منافقت کے رُوح فرسا مناظر دیکھتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بالآخر یہ نقش خود بخود اس کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں کوئی انقلاب انگیز تحریک فکر و عمل ہو تو ہو لیکن دورِ جدید میں یہ ہر لحاظ سے ناقابلِ عمل ہے۔ اب اس کی اگر کوئی افادیت باقی ہے تو صرف اسی قدر کہ یا تو بوقتِ ضرورت اس کا نام لیکر عوام کو بہکایا جائے یا اس سے کبھی کبھی اپنے روحانی احساس کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا جائے۔

بچہ جب ان احساسات کے ساتھ کسی درسگاہ کا رخ کرتا ہے تو وہاں کا ماحول انہیں مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ تعلیم گاہ کی پوری فضا میں اسلام سے گریز کے واضح رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اساتذہ کے لباس، بول چال، چال ڈھال، اخلاق و اعمال، ان کا جذبۂ نمائش، ذرا ذرا سی باتوں پر ان کی آپس کی شکر رنجیاں، اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کا تغافل، دولت کے حصول کے لیے ناجائز طریقوں کا استعمال، امتحانات میں بددیانتی، یہ وہ عام بیماریاں ہیں جو قریب قریب ہر تعلیمی ادارے میں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج استاد کا وہ احترام اور اُس کے ارفع و اعلیٰ پیشے کی وہ تقدیس باقی نہیں رہی جو معلّمِ اخلاق ہونے کی وجہ سے کبھی اُسے حاصل تھی۔

پھر جماعتوں میں وہ جو صورتِ حال دیکھتا ہے اُس سے اُسے اسلام کے بارے میں اور بھی بے یقینی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ معاشیات کا سبق پڑھنے کے لیے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو وہ یہ سنتا ہے کہ معاشیات کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ روحانی، مذہبی اور اخلاقی بندشیں معاشی ترقی کے لیے روگ ہیں۔ روزہ سے استعدادِ کار کم ہوتی ہے۔ نماز اوقاتِ کار کا اچھا خاصا حصّہ ضائع کر دیتی ہے۔ حج سے زرِ مبادلہ کا نقصان ہوتا ہے مساجد کی تعمیر سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بیکار ہو جاتے ہیں۔ زکوٰۃ ایک رجعت پسندانہ اور غیر عادلانہ ٹیکس ہے جس میں بنیادی تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ سُود کے بغیر معاشی ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ سٹّے کے ذریعہ ہی قیمتوں میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

نفسیات میں ایک بچے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ خدا، نبوت، وحی، الہام، حشر و نشر یہ سب اوہام ہیں جو تاریکی میں انسان کے دل و دماغ کے اندر خود بخود پلتے رہتے ہیں۔ نیکی و بدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب اضافی و اعتباری باتیں ہیں۔ حسی لذات کی تسکین میں کسی نوعیت کی قدغن انسان کو مختلف قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے اس لیے انسان کو ان بندشوں سے آزاد رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

فلسفہ اور نفسیات کا دورِ جدید میں جس نہج پر ارتقاء ہوا ہے۔ اس کا مطالعہ ایک نوجوان کو، جو اپنے اندر ناقدانہ صلاحیتیں نہ رکھنے کی وجہ سے غلط اور صحیح کے درمیان اچھی طرح امتیاز نہیں کر سکتا، مذہب کا باغی بنا دیتا ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں کیا جاتا ہے کہ خدا کا تصور دراصل طبیعی قوتوں کے ہاتھ میں انسان کی بے بسی کا نتیجہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام معاذ اللہ بعض نفسیاتی بیماریوں کے زیرِ اثر ماورائی باتیں کر دیا کرتے تھے جنہیں انجان لوگوں نے وحی و الہام مان کر سینے سے لگا لیا۔

ان گمراہ کن افکار و نظریات نے ادب کو بھی بڑی حد تک مسموم بنا دیا ہے۔ دورِ جدید کا ادب پڑھ کر انسان کے اندر اس

دیکھے بھالے، بن سوچے، جانے پہچانے، بن بوجھے

وجود کا احساس، جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے، پختہ ہونے کی بجائے مضمحل ہوتا ہے اور انسان اُسے بدیہی حقیقت سمجھنے کے بجائے محض اپنی ذاتی کیفیات کا پرتو سمجھنے لگتا ہے۔

اور تو اور، مناظرِ فطرت جو انسان کے اندر ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ ممد معاون رہے ہیں، آج انہیں بھی باری تعالیٰ کے وجود کے انکار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کے ذہنوں میں اس باطل خیال کی آبیاری کی جاتی ہے کہ فطرت کا یہ جمال کسی حسنِ ازل کی جھلک نہیں بلکہ اندھے، بہرے مادہ کی کرشمہ سازی ہے۔

اس غیر اسلامی معاشرت، درسگاہوں کے غیر اسلامی ماحول اور نصاب کے غیر اسلامی مزاج کے ہوتے ہوئے نوخیز نسلوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلام کی علمبردار بن کر دنیا میں سرگرم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل ہونگی محض خود فریبی ہے۔ اگر ہم واقعی اپنی آنے والی نسلوں کو اسلام کا خادم بنانے کے متمنی ہیں تو پھر ہمیں سب سے پہلے اسلام کے بارے میں اپنے فکر و نظر کے زاویوں اور اپنی عقیدت و محبت کے انداز کو بدلنا چاہیے۔ ہم جب تک اسلام کے معاملے میں یکسو نہیں ہو جاتے اور اسے اپنی زندگی کی غایت الغایات ٹھہرا کر اس کی پیروی کا ارادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں کر لیتے اس وقت تک ہماری نوخیز نسلیں منافقت کی اس بیماری سے نجات نہیں پا سکتیں جو ہمارا پورا ماحول انہیں لگا رہا ہے۔

اس کے بعد درسگاہوں کے ماحول کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں سب سے پہلی تبدیلی یہ کرنی ہوگی کہ مخلوط تعلیم کی بساط کو جلد از جلد لپیٹ دیا جائے۔ یہ چیز اسلام کے نظامِ معاشرت اور اخلاقی اقدار کے خلاف ایک کھلا چیلنج ہے جسے کوئی مسلمان قوم ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی اگر اس کے اندر اپنے مسلمان ہونے کا کچھ بھی شعور باقی ہو۔

اس کے علاوہ نصابِ تعلیم میں بھی بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ابتدا ہی میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ محض چند مضامین کے تغیّر و تبدل سے نوخیز نسلیں اسلامی سانچوں میں نہیں ڈھل سکتیں۔ ہمیں لازماً سارے علوم و فنون کو اسلام کے اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنا پڑے گا۔ مغربی علوم کو جوں کا توں اپنا کر ان کے ساتھ اسلامیات کے چند اسباق کو الگ سے شامل کر لینا تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس ملغوبے سے طلبہ کی تخلیقی صلاحیتیں اُبھرنے کے بجائے اُن کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوگا۔

نظامِ تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ زبان کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم و فنون کے متعلق اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع ہوتا ہے، اسی طرح زبان کے مسئلے کو بھی یہ حضرات محض ایک ادبی مسئلہ سمجھتے ہیں جس کا کوئی تعلق، کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے جس میں کوئی شخص مبتلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو سکتا ہے۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات، جذبات کی ساری منتشر طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں۔ اس سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پرورش پاتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرزِ فکر اور ایک خاص سیرت و کردار پر منتج ہوتا ہے۔ اس کی وساطت سے ایک قوم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات سے وابستہ رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر قومیت کے بنانے اور بگاڑنے میں، تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کرنے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جو قوم غیروں کی زبان سے اپنے احساسات و افکار ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتی ہو اور اسے اپنا شعار بنانے کی آرزومند ہو، وہ ہمیشہ ذہنی غلامی میں مبتلا رہتی ہے اور جسم کی آزادی اُس کے کچھ کام نہیں آتی۔ اُس کے افراد کی تخلیقی قوتیں کبھی پروان نہیں چڑھتیں اور وہ دنیا میں ایک آزاد، باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے بجائے دوسری قوموں کی تابعِ مہمل بن کر زندگی بسر کرتی ہے۔

ادارۂ بتول کی زیرِ نگرانی

پاکستان سے

قیمت فی پرچہ ۲/ پیسے

پندرہ روزہ **"الحسنات"**

زر سالانہ ۷ روپے

کا جلد اجراء ہو رہا ہے

ابتدائی انتظامات مکمل ہوتے ہی اعلان کر دیا جائے گا۔ خریدار اور ایجنٹ حضرات درجِ ذیل پتہ پر رجوع فرمائیں۔

ادارۂ بتول۔ ۴۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور

© rasailojaraid.com